اردو کے فروغ میں ماہ نامہ ادبی دنیا کا کردار

نصیر احمد

پی ایچ ڈی سکالر (اردو)

شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

ڈاکٹر سمیرا اعجاز

اسسٹنٹ پروفیسر اُردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

ROLE OF MONTHLY ADABI DUNYA IN PROMOTION OF URDU

Naseer Ahmad

PhD Scholar (Urdu) University of Sargodha

Sameera Ijaz, PhD

Assistant Professor of Urdu, University of Sargodha

Abstract

Monthly Adbi Dunya was launched in May 1929 from Lahore under the editorship of Maulana Tajwar Najeebabadi. It chiefly concerned with survival, conservation and promotion of Urdu language and literature. In 1939 when Maulana Salah Udden Ahmad took charge of Adbi Dunya, Urdu Hindi controversy was at its peak. Maulana tried to promote Urdu language through its editorials and started printing a phrase 'Urdu Bolo' in order to check the increasing political popularity of Hindi. He also raised voice against the supremacy of English language. ''Adbi Dunya'' struggled hard to strengthen public Urdu friendship. It got strong appeal at public level but failed to get the same response at government level. Therefore, the tangled issue of Urdu as a national language could not be solved till now.

Keywords:

اردو، ہندی، ادبی دنیا، صلاح الدین احمد، قاہرہ، لکھنؤ، لاہور، قومی زبان، تہذیب، مخزن

اُردو ہندی تنازع میں جہاں ہندو مسلم مذہبی، تہذیبی وثقافتی اور سیاسی تنظیموں اور اداروں نے اہم کردار ادا کیا، وہاں مختلف اخبارات اور رسائل وجرائد کا کردار بھی نا قابلِ فراموش ہے۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۶۸ء کے اجلاس میں جب الہ آباد انسٹی ٹیوٹ نے یہ طے کر دیا کہ دیوناگری رسم الخط کو بہر حال رواج دینا ہے اور اجلاس کی روداد ہندی میں مرتب ہوئی تو اِس بحث میں شدت ووسعت پیدا ہوگئی اور اُردو ہندی کی موافقت ومخالفت میں مضامین کی اشاعت کا طویل سلسلہ قائم ہوگیا۔ چوں کہ اُردو ہندی تنازع ۱۸۶۸ء سے ۱۹۴۷ء (تقسیمِ ہندوستان) تک شدومد سے جاری رہا، اس عرصہ میں شائع ہونے والے تمام اہم رسائل نے اس مسئلے کو اپنے صفحات پر موضوعِ بحث بنایا۔ جن رسائل نے اُردو ہندی تنازع کو ترجیحی بنیادوں پر اجاگر کیا اُن میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب (لکھنو)، اودھ اخبار، ہمدرد، کامریڈ، زمیندار، مخزن، ہماری زبان، ہمایوں اور ادبی دنیا قابلِ ذکر ہیں۔ ''ادبی دنیا'' اپنے عہد کے رسائل میں ایک منفرد حیثیت رکھتا تھا۔ یہ کسی سیاسی یا مذہبی تنظیم سے منسلک نہیں تھا۔ اس کا منصب محض صحافتی نہیں بل کہ خالصتاً ادبی، تخلیقی اور حرکیاتی تھا۔ مئی ۱۹۲۹ء میں ماہنامہ ادبی دنیا کا آغاز ہوا تو اس نے نہ صرف اُردو شعر وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا بلکہ اُردو زبان کے فروغ اور تحفظ کا فریضہ بھی بخوبی سرانجام دیا۔ ۱۹۳۹ء میں جب مولانا صلاح الدین احمد نے ادبی دنیا کی ادارت کے باقاعدہ امور سنبھالے تو اُردو ہندی تنازع نے مسلمانوں اور ہندوؤں میں ایک رقیبانہ کش مکش کی صورت اختیار کر لی تھی۔ بھارتیہ ساہتیہ پریشد میں مہاتما گاندھی نے کہہ دیا تھا کہ ''اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا ہے اور مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔''(۱)

گاندھی جی کے اس بیان کا سب سے زیادہ خیر مقدم ہندو طبقے میں ہوا اور ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اُردو کو چھوڑ کر ہندی کے حلقے میں شامل ہونے لگی۔ دوسری طرف مسلمان اکابرین کا خیال تھا کہ اُردو محض مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ تمام ہندوستانیوں کی زبان ہے اور اس کی تعمیر وتشکیل میں امرا کی بجائے صوفیا، غربا اور فقرا نے زیادہ حصہ لیا۔ چناں چہ انھوں نے اُردو کو تحفظ دینے اور اس کی قومی اور بین الاقوامی حیثیت اجاگر کرتے ہوئے اس نقطہ نظر کو ابھارنے کی کوشش کی جو بقول میاں بشیر احمد یہ تھا کہ ''اُردو ہندوستان کی قومی زبان ہے۔ مسلمان جب پہلے پہل ہندوستان میں آئے تو ان کی مذہبی زبان عربی اور تمدنی زبان فارسی تھی۔ رفتہ رفتہ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کا میل جول شروع ہوا تو ملک کے مختلف حصوں میں بولی جانے والی زبانوں میں عربی، فارسی کے الفاظ داخل ہونے شروع ہوئے اور اس سلسلے میں اُردو وجود میں آئی۔ اس زبان کا رسم الخط فارسی تھا لیکن اس کے قواعد اور اس کے لفظوں کا بیشتر ذخیرہ ہندوستان کی پیداوار تھا۔''(۲)

اُردو کے دفاع میں مولانا صلاح الدین احمد کا رویہ بھی دوسرے مسلمان زعما سے مختلف نہیں تھا۔ انھوں نے اولاً اُردو کو خالصتاً مسلمانوں کی زبان تسلیم نہیں کیا۔ ثانیاً اُردو کے فروغ وارتقا میں صوفیا، فقرا اور غربا کے بنیادی کردار کو اجاگر کرتے ہوئے بالواسطہ اس تصور کا بطلان کیا کہ اُردو کو مسلمان بادشاہوں نے پالا پوسا ہے۔ ان کا موقف تھا کہ ''اُردو اور غریبی کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ وہ غربت کی آغوش میں پیدا ہوئی ہے۔ اپنے پالنے میں اس نے وہی لوریاں سنیں ہیں جو عوام کے محبوب فقرا اور صلحا کے کلام سے ماخوذ تھیں۔ اس کا بچپن، تنگ وتاریک گلی کوچوں میں کھیلتے کودتے گزرا ہے اور جب نامِ خدا وہ جوان ہوئی تو ہر خاص وعام کی نگاہ اس پر پڑنے لگی، خواص اب بھی اسے پاس بلاتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔''(۳)

''ادبی دنیا'' مولانا صلاح الدین احمد کے انھی خیالات ونظریات کا ترجمان تھا۔ اُردو زبان کے حق میں انھوں نے جو آواز اٹھائی اسے ادبی دنیا نے ہندوستان کے طول وعرض میں پہنچایا۔ مولانا نے ادبی دنیا میں اُردو زبان کی حمایت میں مضامین شائع کیے، ادارتی شذروں میں اُردو زبان کے مقاصد کو فروغ دینے کی سعی کی۔ سب سے اہم بات یہ کہ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے آغاز (۱۹۴۱ء) میں ہندی زبان کے بڑھتے ہوئے سیاسی طغیان کو روکنے کے لیے ''اُردو بولو'' تحریک جاری کی۔ یہ تحریک ادبی دنیا کے صفحات سے ابھری اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک بھر میں مقبول ہوگئی۔ اس تحریک کا کوئی تحریری مینی فیسٹو تو موجود نہیں تھا لیکن مولانا نے اسے مقبول بنانے کے لیے جو نعرہ متعارف کروایا اس میں اپیل بھی موجود تھی اور عمل کی ترغیب بھی۔ مولانا صلاح الدین احمد کا موقف تھا کہ اگر مائیں اور بہنیں اپنے بچوں اور بہن بھائیوں کے ساتھ اور استاد اپنے ننھے شاگردوں سے اُردو میں بات چیت کریں تو کل اُردو اُن کی مادری زبان قرار پائے گی۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے عام لوگوں سے بالعموم اور اُردو پڑھانے والے اساتذہ سے بالخصوص ابتدائی سطح پر اُردو بولنے کی اپیل کی اور قوم کو اُردو بولو جیسا نعرہ دیا۔

اُردو بولو یکسر تعمیری تحریک تھی جس میں شکست وریخت کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ یہ تو ایک معاہدہ تھا جو ہر اُردو بولنے والا اپنے آپ سے کرتا تھا اور اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں خود ہی ندامت کا شکار بھی ہوتا تھا چناں چہ اُردو بولو تحریک کے آغاز کے کچھ عرصہ بعد ہی خاطر خواہ نتائج آنا شروع ہوگئے۔ جولائی ۱۹۴۳ء میں مولانا صلاح الدین احمد نے قارئینِ ادبی دنیا کو نوید دی کہ ''آثار نہایت مبارک ہیں اور اگر کام کرنے والوں کا جوش ٹھنڈا نہ ہوا تو کچھ عجب نہیں کہ ہمارے بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد عادتاً اُردو بولنے لگے اور آئندہ چند سالوں میں ہندوستان کے لسانی نقشے میں ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہو جائے گی۔''(۴)

اُردو بولو ایک قابلِ قدر مقصدی تحریک تھی۔ ۱۹۴۵ء میں یہ ادبی دنیا کا مستقل حصہ بن چکی تھی۔

ادبی دنیا اور اُردو بولو تحریک لازم وملزوم تھے۔ادبی دنیا کا سرورق الٹتے ہی پہلی ملاقات اس تحریک سے ہوتی اور اس کے بارے میں ایک چھوٹا سا ادب پارہ دامن کشِ دل ونظر ہوتا۔ادبی دنیا نے ایسے سلوگن بنائے جن سے اُردو زبان کا تعلق ہندوستانی قومیت کے ساتھ قائم ہوتا تھا۔ان نعروں (سلوگن) کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

- ''قاہرہ سے لے کر شنگھائی تک اُردو یکساں طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔اُردو بولو۔''(۵)
- ''اُردو بولو۔اُردو بولنے سے آپس میں محبت بڑھتی ہے۔''(۶)
- ''اُردو ایشیا کی سب سے بڑی زبان ہے۔اُردو بولو اور ایشیا کی سب سے بڑی قوم بن جاؤ۔اُردو بولو۔''(۷)
- ''اُردو بولو اگر آپ کی زبان ایک ہے تو کبھی نہ کبھی آپ کے دل بھی ایک ہو جائیں گے۔''(۸)
- ''اُردو اور انگریزی۔انگریز اور امریکن کو انگریزی زبان ملاتی ہے۔ہندو اور مسلمان کو اُردو زبان ملائے گی۔اُردو بولو۔''(۹)
- ''اُردو بولو۔اُردو بولنے سے ہماری قومی غیرت بڑھتی ہے۔اُردو کو انگریزی کی جگہ دے کر اپنا قومی وقار بڑھایئے۔اُردو بولو۔''(۱۰)
- ''پنجابی، پشتو، سندھی سب ہمیں پیاری ہیں مگر اُردو ہماری جان اور ایمان ہے۔اُردو بولو اور ایک ہو جاؤ۔اُردو، اُردو، اُردو۔''(۱۱)
- ''ہم زبانی، ہم دلی کی پہلی شرط ہے۔اُردو بولو اور یک جان ہو جاؤ۔''(۱۲)
- ''اُردو وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔اُردو بولو۔''(۱۳)
- ''اُردو بولنے والا دنیا بھر میں کہیں اجنبی نہیں۔اُردو بولو اور دنیا کے شہری بن جاؤ۔''(۱۴)

یہ سلوگن ''ادبی دنیا'' کے ابتدائی صفحے پر جلی الفاظ میں لکھے ہوتے۔عام طور پر طویل مضامین میں مفہوم خبط ہو کر رہ جاتا ہے اور عام قاری اس کی مقصدیت اور افادیت سے کماحقہٗ واقف نہیں ہو سکتا۔ادبی دنیا کے چھوٹے چھوٹے سلوگن قاری کی نگاہ کا مرکز ہی نہ بنتے بلکہ اس کی توجہ بھی کھینچتے اور دیرپا اثر بھی چھوڑتے۔یہی وجہ ہے اس تحریک کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی اور اسے سوسائٹی کے ہر طبقے نے قدر کی نظر سے دیکھا۔سیاست دانوں، طالب علموں اور تاجروں نے یکساں طور پر اس کا خیر مقدم کیا۔اگرچہ ہندوستان خاص طور پر پنجاب میں بہت سی انجمنیں کام کر رہی تھیں لیکن جو پذیرائی ''اُردو بولو'' تحریک کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکی۔مولوی عبدالحق، مولانا صلاح الدین احمد کے نام ایک خط میں اس تحریک کے کردار کو اس طرح سراہتے ہیں:

''آپ کی تحریک اُردو بولو نہایت قابل قدر اور لائق عمل ہے۔ یوں تو پنجاب اور خاص کر لاہور میں بہت سی انجمنیں اور بزمیں ہیں اور کام بھی کرتی ہیں لیکن ان سب کے کام ملا کر بھی اس تحریک کو نہیں پہنچتے۔ یہ بنیادی کام ہے۔ اس وقت تو شاید لوگ اسے زیادہ اہمیت نہ دیں لیکن ایک وقت آئے گا جب اس کے حیرت انگیز اور دوررس نتائج کا قائل ہونا پڑے گا۔ اس کی کامیابی پر ہمارے بہت سے مسائل کی کامیابی کا انحصار ہے۔''(۱۵)

یہ امر مولانا صلاح الدین احمد کے لیے باعث مسرت تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اہل ملک نے وحدتِ زبان کے راز کو سمجھ کر اس پر سنجیدگی سے غور کیا تو نہ صرف ہمارے بیش تر تعلیمی اور تمدنی مسائل خوش اسلوبی سے حل ہو جائیں گے بلکہ بہت سی ایسی سماجی اور سیاسی ترقیاں بھی نظروں کے سامنے آ جائیں گی جو اب تک ذہنوں سے دور ہیں۔ چناں چہ انھوں نے اُردو بولو تحریک میں مزید تیزی پیدا کی۔

جب زعمائے آزادی، اُردو کا تحفظ سیاسی خطوط پر استوار کر رہے تھے اور اس کے لیے انگریزی سرکار کی خدمت میں مطالبات پیش کر رہے تھے، مولانا صلاح الدین احمد نے ان وسائل کو بروئے کار لانے کی کوشش کی جو انھیں فی الوقت دستیاب تھے۔ مولانا نے اس تحریک کا کام سیاسی رہنماؤں کو سونپنے کی بجائے اساتذہ کو تفویض کیا جو شہروں کی بجائے دور دراز کے قصبات اور دیہاتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ اساتذہ ادبی دنیا کے مستقل قاری تھے اور اس کی آواز پر لبیک کہتے تھے۔ اُردو بولو تحریک کا ایک بڑا مقصد بچوں کو اُردو بولنا سکھانا تھا تا کہ وہ اپنے خیالات و احساسات کو بلا تکلف اپنی قومی زبان میں ادا کر سکیں۔ یہ کام اساتذہ بخوبی سرانجام دے سکتے تھے۔

اُردو بولو تحریک کا ایک مقصد اُردو زبان کو عملی زندگی میں رائج کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے مولانا صلاح الدین احمد نے اس بات پر زور دیا کہ روزمرہ زندگی میں چھوٹے بڑے سب ایک دوسرے سے اُردو میں بات چیت کریں کیوں کہ زبان اس وقت تک اپنائی نہیں جا سکتی جب تک زندگی خود اس میں داخل نہ ہو۔ لہٰذا انھوں نے تجویز دی کہ ''بچوں سے اُردو میں باتیں کیجیے۔ بڑوں سے اُردو میں جھگڑیے۔ زبان اپنا راستہ آپ ہی پیدا کرتی چلی جائے گی۔''(۱۶)

پنجابی اور اُردو کے مابین تفاوت رفع کرنے اور انگریزی کی بالادستی کو کم کرنے میں ادبی دنیا نے اہم کردار ادا کیا۔ مولانا صلاح الدین احمد کا عقیدہ تھا کہ پنجابی فطرتاً دنیا کا سب سے بڑا زبان دان ہے۔ پنجاب اُردو کا میکہ ہے۔ ہندوستان کی کوئی دو زبانیں آپس میں اتنا میل نہیں کھاتیں جتنا اُردو اور پنجابی۔ ہمارے فقروں کا باہمی ربط، ہمارے الفاظ کی ہم جنسی اور ہمارے قواعد کی یکسانی، ایسی آسانیاں ہیں جو

ہمیں اُردو کو اپنانے میں زیادہ سے زیادہ مدد دے سکتی ہیں۔ اُردو دراصل پنجابی ہی کی ایک نکھری ہوئی صورت ہے اور اگر ہم اسے اپنی روزمرہ کی زبان بنالیں اور اسے بلا تکلف استعمال کرنا شروع کر دیں تو واقعی ہی ہماری زبان بن جائے گی۔ لیکن اتنی گہری مماثلت کے باوجود پنجاب میں اُردو کے بجائے انگریزی زبان کی حاکمیت کو قبول کرنے کا جو رویہ روز افزوں تھا مولانا نے اس پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''پنجاب کو انگریز کی غلامی میں آئے ابھی سو برس بھی نہیں ہوئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کے سر سے انگریز کا سایہء عاطفت اُٹھ بھی گیا تب بھی یہ اُس کی ذہنی غلامی سے شاید کبھی آزاد نہیں ہوگا اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ انگریز کی ہر چیز ہمارے لیے قابل قبول ہے لیکن جونہی کسی موقع پر ہماری قومی زبان انگریزی کی جگہ لینے کی کوشش کرتی ہے وہیں ہم میں صوبائی اور قبائلی تعصبات پیدا ہو جاتے ہیں اور ہم اپنی مقامی بولیوں کو قومی زبان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے اکھاڑے میں اتار دیتے ہیں، ہمیں غیر کی غلامی منظور ہے لیکن خویش کی رہبری گوارا نہیں''۔(۱۷)

ادبی دنیا نے اُردو کو بول چال کی عام زبان کے علاوہ اسے ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے بھی آواز بلند کی۔ مولانا صلاح الدین احمد کو اس بات پر گہرا دکھ تھا کہ یو۔پی کی پانچ یونیورسٹیوں میں سے چار میں اُردو زبان ایم اے کے درجے تک پڑھائی جاتی ہے لیکن پنجاب میں ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے یہ مڈل سے آگے نہیں بڑھی۔ پنجاب کے کالجوں میں ذریعہ تعلیم سراسر اور ثانوی مدارس میں بڑی حد تک انگریزی ہے جس کے نتیجے میں ہمارے بچے اور نوجوان تعلیم کے ان بہتر نتائج سے محروم ہیں جو اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اہل پنجاب کی اس سرد مہری پر مولانا نے گہری تشویش کا اظہار کیا کہ کب اس قوم کو اُردو کی ہمہ گیری اور جامعیت کا صحیح احساس ہوگا؟ اور کب انگریزی زبان کی حاکمیت کا قلع قمع ہوگا؟ لیکن اس تمام صورت حال کے باوجود مولانا حالات سے مایوس نہیں تھے اُنھیں پنجاب میں اُردو کا مستقبل روشن نظر آ رہا تھا۔ انھوں نے اُمید ظاہر کی کہ ''اُردو کا یہ پودا جو دوآبہ گنگ وجمن کی شادابیوں میں جوان ہوا تھا اب پانچ دریاؤں کی سرزمیں میں لہلہائے گا اور اس کے پھل کی شیرینی اور لطافت میں پنجاب کی آب وہوا ایک نیا رس پیدا کرے گی اور ہماری زندگی اس رس سے ایک نئی قوت اور توانائی حاصل کرے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سچ مچ اسے اپنا سمجھیں اور اسے مخالفت کی آندھیوں سے اور تعصب اور سازش کے بگولوں سے بچائیں۔''(۱۸)

ایک طرف ادبی دنیا اُردو کو عوام کی سطح پر مقبول بنانے کا خواہش مند تھا تو دوسری طرف ہندی نواز لوگ اپنی اُردو دشمنی کا مظاہرہ کرنے میں کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ یہ لوگ اُردو کے خلاف

رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے ہندوستان کے اہم مقامات پر جلسے منعقد کرتے۔اس قسم کا کوئی جلسہ منعقد ہوتا اور اُردو دشمنی کا کوئی منصوبہ منظرِ عام پر آتا تو ادبی دنیا میں اس پر سخت ردعمل ظاہر کیا جاتا۔ جون ۱۹۴۵ء میں لاہور میں بہاری لال چامنہ کی صدارت میں پنجاب ساہتیہ منڈل کا ایک جلسہ ہوا اور اس میں ایک قرارداد کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ریڈیو کی زبان عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت کے باعث حد درجہ ناقابل فہم ہے لہٰذا اس محکمے کے عملے میں فوری تبدیلیاں کی جائیں اور ۷۵ فی صد آسامیاں ایسے لوگوں سے پُر کی جائیں جو ہندی دان عوام کے نمائندہ ہوں نیز مطالبہ کیا گیا کہ ریڈیو کا محکمہ سر سلطان احمد سے لے کر کسی بہتر شخص کے سپرد کیا جائے۔(۱۹) کچھ اس طرح کی ایک قرارداد دلّی کے جلسے میں منظور کی گئی جس میں سر سلطان احمد کے ساتھ پروفیسر پطرس بخاری کو بھی برطرف کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ادبی دنیا نے ان قراردادوں پر بروقت ردعمل ظاہر کیا۔اس نے لالہ نانک چند ناز، پنڈت میلا رام وفا، مہاشہ کرشن اور خوش حال چند خورسند کے ادارتی شذروں سے فارسی اور عربی آمیز اُردو کے اقتباسات پیش کرتے ہوئے لکھا کہ ''یہ ایسی زبان ہے جو ریڈیو والوں کے کان کاٹتی ہے، لیکن ان ہندوؤں کی ساری اخبار نویسی اسی زبان میں ہو رہی ہے۔کیوں کہ وہ نہیں چاہتے کہ لوگ ان کا اخبار پڑھنے کی بجائے اس سے پڑیاں باندھ کر سودا بیچیں۔''(۲۰)

اُردو زبان کی مخالفت، تعصب اور سازش کے بگولوں کی ایک لہر تو ہندی دانوں کی طرف سے اٹھ رہی تھی لیکن ایک لہر خود اُردو دان طبقے نے پیدا کر دی اور وہ بھی اس وقت جب زبان کا مسئلہ ایک اہم قومی اور بین الاقوامی مسئلہ کی صورت اختیار کر چکا تھا اور ہندوستان کی آئندہ قسمت کے فیصلے میں وحدتِ زبان ایک نمایاں کردار ادا کرنے والی تھی۔مثلاً دلّی کے ایک اُردو ماہنامہ میں ایک مسلمان ادیب نے صوبائی تعصب کو ہوا دیتے ہوئے لکھا کہ یو۔پی والے اپنی زبان بھولتے چلے جا رہے ہیں اور اُردو محاوروں کی پنجابی شکلیں زبانوں پر چڑھتی جا رہی ہیں۔مولانا نے اس رویے پر رنج کا اظہار کیا اور اسے اُردو پر اپنوں کی طرف سے خنجر آزمائی کے مترادف قرار دیا۔تاہم انھوں نے خبردار کیا کہ ''یو۔پی میں ہندی یلغار کرتی ہوئی ہر طرف سے اُردو پر چڑھ آئی ہے اور کوئی دن کی بات ہے کہ صوبہ جات متحدہ ''جٹ پرانت'' بن کر رہ جائیں گے اور پھر اُردو اور اُردو والوں کا جو حشر ہوگا اس کا تصور بھی لرزہ خیز ہے۔''(۲۱)

مولانا صلاح الدین احمد نے اُردو بولو تحریک کی عملی ہیت میں تبدیلی پیدا کی اور عوام الناس کو تلقین کی کہ آج ہی سے اُردو بولنے کا عزم کر لیجیے اور اس میں وہ الفاظ اور محاورے بلا تامل شامل کرتے چلے جایئے جو ان کی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔چناں چہ انھوں نے جو لائحہ عمل اختیار کیا وہ یہ تھا کہ ''اُردو بولو، بے تکلف اُردو بولو، اپنے انداز میں بولو اور بولتے چلے جاؤ۔''(۲۲)

مولانا صلاح الدین کا موقف یہ تھا کہ بولنے کی زبان تو خالصتاً عوام کی چیز اور ان کے جذبات اور ماحول کی ترجمان ہوتی ہے۔اس لیے بول چال میں کسی کڑی پابندی اور مقررہ معیار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چناں چہ انھوں نے قوم کو باور کرایا کہ ''اُردو زبان زندگی کی ترجمان ہے اور اپنے اندر نشو ونما اور توسیع وتعمیر کے حیرت انگیز عناصر رکھتی ہے۔اس نے نہایت قلیل عرصہ میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ دنیا کی سب سے دل کش اور آسان زبان ہے پھر وہ کون سی مصیبت ہے جو ہمیں اسے اپنے گھروں میں بولنے سے باز رکھتی ہے۔یاد رکھیے! جب تک آپ اُردو بولیں گے نہیں آپ کبھی اس میں اپنے جذبات وخیالات کا بے تکلف اظہار نہیں کر سکیں گے۔''(۲۳)

مولانا نے ہر اس عمل کو سراہا جو اُردو کی ترویج کا موجب تھا اور ہر اُس کوشش کی مخالفت کی جو اُردو کے نفاذ اور ترقی میں رکاوٹ کا باعث تھی۔۱۹۴۶ء میں ملک کی متعدد یونی ورسٹیوں نے آئندہ تعلیم وتدریس انگریزی کی بجائے صوبائی زبانوں میں دینے کا اعلان کیا بظاہر یہ ایک خوش آئند بات تھی لیکن مولانا نے اس سے اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے ان محرکات کی نشان دہی کی، جو اس اعلان کے پسِ پردہ تھے۔انھوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ ''اس عمل سے بعض جامعات میں ان طلبا کی تعلیم خطرے میں پڑ جائے گی جن کی زبان اُردو ہے۔''(۲۴) اسی سال جب لکھنو یونی ورسٹی نے بی۔اے کا امتحان دینے والے امیدواروں کو اس امر کا اختیار دیا کہ وہ اپنے جوابات اُردو یا ہندی میں لکھ سکتے ہیں تو مولانا نے اس فیصلے پر اطمینان کا اظہار کیا:

> ''جامعہ لکھنو کا یہ اقدام ہماری اُردو زبان کے لیے ایک نہایت مبارک اور مفید اقدام ثابت ہوگا۔توقع ہے کہ لکھنو کے بعد الٰہ آباد اور آگرے کی یونی ورسٹیاں بھی اس راستے پر چل پڑیں گی اور بنارس اور علی گڑھ کے لیے ان کی پیروی کرنا ایک قدرتی امر ہوگا۔''(۲۵)

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کا واقعہ ہوا، آزادی تک اُردو بولو تحریک کے دُور رس اثرات مرتب ہو چکے تھے۔اس عرصہ میں مولانا نے اُردو کو عوامی، قومی اور تعلیمی زبان بنانے کی جدوجہد کی۔ہندی کے غلبے اور انگریزی کی بالادستی کے خلاف آواز اٹھائی اور پنجاب کو اس زمین کا نیا وطن قرار دیا۔تقسیمِ ہند کے بعد اُردو بولو تحریک ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔مولانا صلاح الدین احمد نے فروغِ اردو کے لیے ایک نیا لائحہ عمل اختیار کیا۔نئے حالات میں انھوں نے اُردو کے تحفظ اور نفاذ کے لیے جن دو امور کی طرف خصوصی توجہ دی، ان میں اول، اُردو کو بول چال کی زبان بنانا اور اسے بھارت اور پاکستان کے عوام کی تعلیمی ضرورتوں میں ممد ومعاون قرار دینا اور دوم، اُردو کو پاکستان کی قومی زبان تسلیم کروانا شامل تھا۔چناں چہ ان مقاصد کے حصول کے لیے مولانا صلاح الدین احمد کسی اندیشے کو خاطر میں نہ لائے اور فعال انداز میں اُردو زبان کی وکالت

جاری رکھی ۔اُردوایک ایسی زبان تھی جس کے بولنے والے کثیر تعداد میں تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ گئے تھے ۔مولانا اُردوکو برصغیر کے ہند اسلامی کلچر کا مشترکہ ترکہ تصور کرتے تھے ۔اُن کا نظریہ تھا کہ نسل اور خون کے سوا ہر چیز تقسیم ہو سکتی ہے لیکن زبان قابلِ تقسیم نہیں ۔یہی وجہ ہے کہ اُنھیں نہ صرف پاکستان میں اُردو کے فروغ کے مسائل میں دلچسپی تھی بل کہ وہ ہندوستان میں اُردو کے مستقبل کے بارے میں بھی فکرمند تھے ۔انھوں نے اردو کے موضوع پر جب بھی قلم اٹھایا اس کے کھوئے ہوئے دیاروں کا ذکر ضرور کیا اور نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کو اردو کلچر کے تحفظ کی تلقین کی بل کہ اہلِ اقتدار کو بھی باور کروایا کہ وہ اُردو کو متحدہ ہندوستان کی قومیت کی تعمیر کے لیے ایک موثر اور کام یاب ذریعہ بنا سکتے ہیں ۔مولانا نے عملی سطح پر اپنا رخ عوام کی طرف رکھا اور انھیں اردو بولنے اور اُردو کو مادری زبان بنانے کی تلقین کی اور نظریاتی سطح پر روئے سخن اہلِ اقتدار کی طرف رکھا ۔ہندوستان میں اُردو زبان کا مستقبل خطرے میں دیکھ کر انھوں نے اس کا ذمہ دار ہندوستان کے اصحاب اقتدار کو ٹھہرایا ۔چناں چہ ہندوستانی حکومت کے رویے پر تنقید کرتے ہوئے ادبی دنیا میں انھوں نے لکھا کہ

''ایک غلط قسم کی وطنیت اور فرقہ پرستی نے ہندوستان کے صاحبِ اقتدار طبقے میں یہ غلط فہمی پیدا کر دی ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے ۔اس لیے اسے مٹا ہی دینا چاہیے، چاہے اس کے مٹا دینے سے خود اپنی تہذیب اور اپنے کلچر کا ایک نہایت خوب صورت حصہ بھی مٹ جائے ۔''(۲۶)

مولانا نے پیش گوئی کی کہ اگر ہندوستانی صاحب اقتدار کا رویہ اُردو زبان کے بارے میں اسی طرح رہا تو آنے والے دور میں اُردو کے گنگا جمنی اور پاکستانی رنگ میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو جائے گا ۔بولنے کی زبان غالباً زیادہ سخت جان ثابت ہوگی، لیکن تحریری، دفتری اور کاروباری زبان ایک نیا اسلوب اختیار کر لے گی اور اگر صوبہ جات متحدہ کی تعلیمی پالیسی آئندہ دس برس تک یہی رہی تو ۱۹۶۰ء کا ہندی مسلمان نوجوان ایک ایسی بے جان ادبی لاش اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرے گا، جسے اس کے بزرگوں کی غلط سیاست نے جنم دیا تھا ۔(۲۷) آزادی کے بعد جب معاشرے کو کچھ استحکام نصیب ہوا اور حکومت ہند کے منصوبے اور حکمتِ عملیاں منظر عام پر آنے لگیں تو مولانا صلاح الدین احمد نے اس حقیقت کو بھانپ لیا کہ حکومتِ ہند کے تعاون کے بغیر اُردو کے مسائل حل نہیں ہو سکتے ۔انھیں یہ بھی احساس تھا کہ ہندوستان میں اُردو کے ہاتھ سے اقتدار کا دامن چھوٹ چکا ہے لیکن دلوں پر اس کا قبضہ بدستور باقی ہے، اس کے باوجود مولانا نے تعلیمی اور معاشی ضروریات کے لیے دیوناگری کی تحصیل مسلمانوں کے لیے لازمی خیال کی ۔چناں چہ انھوں نے ادبی دنیا کے پلیٹ فارم سے اپنے مخصوص بلند آہنگ لہجے میں کہا:

''ہندی اپنے موجودہ روپ میں کبھی جمہوری زبان نہیں بن سکتی ۔اس نے سیاسی غلبہ حاصل

کرلیا ہے۔اب وہ اس کے نشے میں مدہوش رہے گی۔اُردو کے لیے یہ نا درموقع ہے کہ وہ فوراً دیوناگری رسم الخط اختیار کر کے اپنے ادب کو ایک نیا لباس پہنا دے۔اس طرح ادب کی روح،اس کا جسم اور اس کے ضروری عناصر اسی طرح برقرار رہیں گے صرف لباس تبدیل ہو جائے گا اور اگر لباس تبدیل کر کے جان اور جسم باقی رہ جائیں تو یہ کوئی خسارے کا سودا نہیں۔''(۲۸)

اس دور میں ایک طرف ہندوستانی اردو کو متعدد خطرات درپیش تھے اور اس کا مستقبل مخدوش نظر آ رہا تھا تو دوسری طرف پاکستان میں بھی اردو کی صورتِ حال کوئی تسلی بخش نہ تھی۔ ہندوستان میں اُردو کے مدِ مقابل ہندی زبان تھی لیکن پاکستان میں انگریزی اُردو کے درپے تھی۔مولانا صلاح الدین احمد نے اُردو کو درپیش ان خطرات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ہر فورم پر اُردو کے حق میں آواز بلند کی۔تقسیم کے بعد مولانا نے پاکستانی قوم کو یہ باور کروایا کہ اُردو کی عالم گیر حیثیت ختم ہو چکی ہے اور وہ زبان جو کبھی ایشیا، یورپ اور افریقہ کی ہر بندرگاہ پر بولی اور سمجھی جاتی تھی،اب ایک چھوٹے سے ملک کے ایک حصے کی زبان ہو کر رہ گئی ہے۔انھیں اُردو زبان کے قلزم سے ایک جوئے کم آب بن جانے پر گہری تشویش تھی لہٰذا انھوں نے عوام کو یاد دلایا کہ

''اُردو پنجاب ہی کی بیٹی ہے،یہیں پیدا ہوئی،یہیں پلی اور بڑھی،اس میں کلام نہیں کہ اس کا شباب دلّی،لکھنو اور حیدر آباد میں بسر ہوا ہے لیکن اب کہ اس نے پختہ سالی میں قدم رکھا ہے۔ وہ پھر یہیں لوٹ آئی ہے۔''(۲۹)

اس یاد دہانی کے بعد مولانا نے پاکستانی قوم سے اپیل کی کہ اُردو کو سچے معنوں میں قومی زبان بنالیں،اسی میں سوچیں،اسے ہی بولیں اور اسی میں لکھیں۔یہاں تک کہ یہ زبان ہماری عمیق ترین جذبات اور دقیق تریں خیالات کے مکمل اظہار کا ذریعہ بن جائے۔مولانا نے اُردو کا عوامی روپ نکھارنے کے لیے قوم کو مشورہ دیا کہ'' بے تحاشا اُردو بولتے چلے جایئے اور اس بات کا قطعاً خیال نہ کیجئے کہ آپ کا محاورہ قلعہ معلّٰی یا لکھنو کے چوک کے محاورے کے مطابق ہے یا نہیں،ہمارا مقصد محض زبان کو اپنانا ہے اور زبان اس وقت تک اپنائی نہیں جا سکتی جب تک کہ خود زندگی اس میں داخل نہ ہو جائے۔''(۳۰)

اُردو کے عملی نفاذ کے لیے مولانا نے تجویز دی کہ''اگر ہم اپنے مخاطبین سے اُردو کے سوا کسی اور زبان میں بات کرنے سے انکار کر دیں،اگر ہم ڈاک خانے، ریلوے،میونسپلٹی، یونی ورسٹی، بینک اور انکم ٹیکس وغیرہ کے محکموں سے صرف اُردو میں خط و کتابت کریں اور ان کے انگریزی خطوط واپس کر دیں تو اس بات کی توقع ہے کہ ان اداروں میں اُردو کے رواج کی تحریک چل نکلے گی۔''(۳۱)

ماہنامہ ''ادبی دنیا'' نے اُردو کو بے تکلف اور فطری زبان بنانے کے لیے اسے سخت جکڑ بندیوں سے نجات دلانے، اس کے دروازے صوبائی بولیوں کے مخصوص الفاظ اور محاوروں کے لیے کھولنے اور اس میں انتقالِ علوم کا کام بڑے پیمانے پر جاری کرنے کی تجاویز دیں۔ مولانا نے عام لوگوں کی توجہ علمی و ادبی کاموں کی طرف مرتکز کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے دوسری زبانوں کے علوم کو ترجمہ کے ذریعے اُردو میں منتقل کرنا، اُردو کی نشاۃ الثانیہ کے لیے ضروری قرار دیا اور مشاعروں اور قوالیوں کی شدید مذمت کی۔ مولانا نے مشاعرے کو اُردو کے زوال کا ایک سبب قرار دیا اور اس کا رشتہ سماج کی تماشا بندی کے ساتھ قائم کیا۔ چناں چہ انھوں نے لکھا:

> ''تقسیم کے بعد اگر کسی غنیم نے ہماری توجہ زبان کے حقیقی مسائل کی طرف سے ہٹائی ہے اور اُردو کے وقار کا استخفاف کیا ہے تو وہ یہ مشاعرے ہیں۔ ہماری قومی زبان کی سب سے بڑی ضرورت وہ سنجیدہ اندازِ نظر ہے جو ہر بڑی تعمیر کے لیے شرطِ اولین کی حیثیت رکھتا ہے۔ مترنم مشاعرے نہ صرف اس میں حائل ہوتے ہیں بلکہ ہمارے اسلوبِ نظر کو بدل کر ہمیں پس ماندہ رکھتے ہیں۔''(۳۲)

۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے ڈھاکہ اجلاس میں اُردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دے کر قومی زبان کے مسئلے کو حل کر دیا تھا لیکن افسوس کہ اُردو کو قومی زبان تسلیم کرنے کے باوجود اس کی حفاظت و نفاذ کے لیے کوئی موثر تدبیر عمل میں نہ لائی گئی اور اسے سیاسی مسئلے کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ اس بات نے مولانا صلاح الدین احمد کو ذہنی طور پر شدید صدمہ پہنچایا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ اُردو کو محض کھوکھلے نعروں اور اعلانات سے زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ چناں چہ ان کے لہجے میں شکایت کا عنصر پیدا ہو گیا جس کا اظہار انھوں نے اُردو بولو تحریک کے صفحے پر یوں کیا:

> ''اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک کی سرکاری زبان اُردو ہی کو قرار دیا گیا ہے مگر اس نظریے کی عملی تشکیل کے ابھی کوئی آثار پیدا نہیں ہوئے۔ ایک طرف انگریزی اور دوسری جانب صوبائی زبانیں ابھی اپنے اپنے مقامات پر بدستور قابض ہیں اور بالفرض انھیں ۔۔۔ وہاں سے ہٹنا بھی پڑا تو وہ غیر سرکاری طور پر اسی طرح مقبول رہیں گی، جس وقت تک اُردو ان پر چھا نہیں جاتی اور چوں کہ آج کل معجزے بہت کم معرضِ وقوع میں آتے ہیں اس لیے اندیشہ ہے کہ اگر حامیانِ اُردو کے جمود و سکون کی یہی کیفیت رہی تو اُردو کبھی صحیح معنوں میں ہمارے دیس کی زبان نہیں بن سکے گی۔''(۳۳)

ایک طرف مولانا اُردو زبان کو پاکستان کی قومی زبان تسلیم کروانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے تو دوسری طرف قومی زبان کے مسئلہ پر مشرقی پاکستان میں بنگالی زبان کا شاخسانہ کھڑا ہوگیا۔ جب بنگال سے بنگالی کے حق میں آواز بلند ہوئی تو اس صدائے بازگشت نے مغربی پاکستان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چناں چہ مسٹر جی۔ ایم سید نے سندھ سے یہ مطالبہ کر دیا کہ مغربی پاکستان میں چار مختلف قومیں بستی ہیں جن کی زبان ایک دوسرے سے مختلف ہے، اس لیے اس ملک کو بھی لسانی بنیادوں پر چار مختلف خطوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ جی۔ ایم سید کے اس بیان پر مولانا صلاح الدین احمد نے ادبی دنیا میں گہرے دکھ اور کرب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ قائداعظم نے وحدتِ قومی کے تصور کی جو بنیاد رکھی تھی اس کی اپنی ملت نے سات برس کے قلیل عرصہ میں اسے فراموش کر دیا ہے۔ انھوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ سندھ کے بعد غالباً سرحد کی باری ہے اور پھر ممکن ہے افتراق وانتشار کی یہ وبا پنجاب میں بھی پھیل جائے۔ مولانا صلاح الدین احمد صوبائی زبانوں کے ہرگز مخالف نہ تھے مگر اُن کی نظر میں مغربی پاکستان کی یہ صوبائی زبانیں اپنے اپنے خطے کی بولیاں ہی تو تھیں، جنھیں اپنے محدود ماحول میں جاری رہنے اور پنپنے کا پورا حق حاصل تھا لیکن ایک وسیع، جدید اور ترقی پذیر مملکت کے علمی، تمدنی اور تہذیبی تقاضوں کے پیش نظر ایک ایسی قومی زبان کا وجود از بس ضروری تھا جو ایک صوبائی زبان کے نہ ہوتے ہوئے بھی ان تقاضوں کی تکمیل کی بہترین صلاحیت رکھے۔ مولانا کا دعویٰ تھا کہ ''اُردو اس معیار پر نہ صرف پورا اترتی ہے بل کہ پاکستان ہی میں نہیں، برِعظیم ہند میں بھی کوئی زبان اس اعتبار سے اس کی ہم سری نہیں کر سکتی۔''(۳۴)

پنجاب یونی ورسٹی نے ۱۹۵۳ء میں یہ فیصلہ کیا کہ میٹریکولیشن کے درجے میں ریاضی اور سائنس کی تعلیم اُردو کی بجائے انگریزی میں دی جائے۔ یونی ورسٹی کے اس فیصلے سے اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تمام کوششیں بے سود ہوگئیں۔ آج اگر اُردو کو ثانوی تعلیم سے خارج کیا جا رہا تھا تو کل ابتدائی تعلیم کی باری بھی آ سکتی تھی۔ ادبی دنیا نے اس بات کا بروقت نوٹس لیا اور لکھا کہ اپنی زبان میں تعلیم دینا ایک فطری عمل ہے اور دنیا کے تمام اہم ممالک مثلاً جاپان، چین، برما، ایران، مصر اور ترکی میں اس فطری طریق تعلیم سے بہترین نتائج حاصل کیے گئے ہیں۔ خود اس برِعظیم میں عثمانیہ یونی ورسٹی کے قیام سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ثانوی مدارج تو ایک طرف اعلیٰ مدارج میں بھی قومی زبان کو تعلیم کا نہایت کام یاب اور موثر ذریعہ بنایا جا سکتا ہے لیکن پنجاب یونی ورسٹی نے اس حقیقت کو مطلقاً نظر انداز کر دیا اور قیام پاکستان کے چھ سال کے اندر ہی اُردو زبان کو اُن مدارج سے بھی گرا دیا، جن پر وہ کسی امداد یا سہارے کے بغیر کھڑی تھی۔ چناں چہ مولانا صلاح الدین احمد نے پنجاب یونی ورسٹی کے اس اقدام پر طنز اور افسوس کرتے ہوئے لکھا کہ ''فرنگی تو رخصت ہوگیا لیکن افسوس! اس کے تسلط کا سایہ ہر روز طویل تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔''(۳۵)

مولانا صلاح الدین احمد کو جہاں کہیں اُردو دشمنی نظر آئی انھوں نے ادبی دنیا کے صفحات میں اس کی مذمت کی۔ایک بار جب سرحد اسمبلی میں وزیر مال نے انگریزی میں بجٹ پیش کیا تو چند نوجوان ممبرانِ اسمبلی نے یہ مطالبہ کیا کہ ان تفصیلات کی ایک نقل اُردو زبان میں بھی ہونی چاہیے۔اس موقع پر وزیرِ مال صوبہ سرحد نے اس مطالبے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے کاروبار میں انگریزی کے علاوہ اگر کوئی اور زبان شامل ہو سکتی ہے تو وہ محض پشتو ہے۔پشتو کو اُردو کا نعم البدل قرار دینا مولانا کے نزدیک کٹر قسم کی صوبہ پرستی اور قبیلہ پرستی تھی۔ چناں چہ انھوں نے ''اُردو بولو'' تحریک کے پلیٹ فارم سے وزیرِ مال سرحد کو بلاخوف وخطر مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ شوق سے پٹھان بنے رہیے اور اپنے قدم سرحد کی قوت بخش زمین میں گاڑے رکھیے۔لیکن اپنے سروں کو اونچا کر کے اس نسیم روح پرور (اُردو) سے بھی زندگی حاصل کیجیے جو پہلے گنگ وجمن کی وادی سے چلتی تھی اور اب راوی کے کنارے سے ابھرتی ہے اور جس خارزار سے گزرتی ہے اپنے جلو میں گل وریحان کے تختے کھلاتی چلی جاتی ہے۔اُردو ہندوستان بھر ہی کی نہیں بلکہ سارے مشرق کی زبان بن رہی ہے اور وہ دن دور نہیں جب ایک سیاح قاہرہ سے چلے گا اور شنگھائی تک چلا جائے گا اور راستہ بھر اسے اُردو کے سوا اور کسی زبان کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔''(۳۶)

اس طرح جب صدر مملکت ایوب خان نے پہلی بار گول باغ میں پوٹھوہاری (پنجابی) میں تقریر کی تو مولانا صلاح الدین احمد نے ادبی دنیا کے اداریہ میں خدشہ ظاہر کیا کہ اگر یہ رسم چل نکلی تو اُردو زبان کے فروغ کو سخت نقصان پہنچے گا۔چناں چہ انھوں نے لکھا کہ ''خدا وہ دن نہ لائے کہ ہم اُردو کو پاکستان میں اس قدر ذلیل ہوتا دیکھیں،لیکن آثار بہت بُرے ہیں کسے خبر تھی کہ چرخِ نیلوفری کی ایک ہی گردش سے اُردو اس خطہ مقدس میں، جو اس تہذیب کے فروغ کے لیے معرضِ وجود میں لایا گیا تھا،اجنبی،غریب اور بے کس ہو کر رہ جائے گی۔''(۳۷) مولانا کے احتجاج کا یہ اثر ہوا کہ صدر مملکت نے پھر قوم سے اُردو میں خطاب کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی ملک کی قومی یک جہتی کے لیے زبان کا ایک ہونا ضروری ہے۔ہماری مملکت خداداد کی وحدت کے لیے بھی قومی زبان کا ہونا لازمی ہے اور یہ منصب صرف اُردو ہی کو دیا جا سکتا ہے۔کیوں کہ یہ زبان نہ صرف برصغیر پاک وہند میں بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ ہمارا ادبی،مذہبی اور تاریخی سرمایہ بھی اسی زبان میں محفوظ ہے۔یہی وجہ تھی کہ قومی زبان کو صوبائی اور علاقائی تعصب سے بچانے کے لیے مولانا صلاح الدین احمد ہمیشہ تحریر وتقریر کے ذریعے بڑی جرات سے جہاد کرتے رہے۔قومی زبان کے تحفظ کے لیے انھوں نے اربابِ اقتدار کے سامنے ایک اعلیٰ درجے کے دارالمصنفین کے قیام کی تجویز پیش

کی لیکن افسوس اس تجویز پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔مرکزی حکومت نے اس سکیم کو ناموزوں قرار دیا۔جس پر مولانا صلاح الدین نے ''بزم ادب'' میں حکومت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ ''جن قوموں کے سامنے زندہ رہنے کا کوئی پروگرام ہوتا ہے۔ان کے یہ ڈھنگ نہیں ہوا کرتے۔ہمیں معلوم ہے کہ حکومت بہت سے بے فائدہ اور نمائشی امور پر پانی کی طرح روپیہ بہانے کی خوگر ہے لیکن جب اس کے سامنے کوئی کام کی بات رکھی جاتی ہے تو ایک بے مثال اندازِ بے نیازی سے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا جاتا ہے۔چناں چہ اُردو اکیڈمی کی جامع اور مفصل سکیم کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔''(۳۸) اسی طرح مولانا صلاح الدین احمد نے صاحب اقتدار کو ''مغربی پاکستان کی قومی اکادمی'' کے قیام کا منصوبہ پیش کیا۔لیکن اس منصوبے پر بھی حکومت نے مثبت ردِعمل کا مظاہرہ نہ کیا۔اور بالآخر مولانا نے اپنے دستیاب وسائل سے مئی ۱۹۵۱ء میں اکادمی پنجاب کی بنیاد رکھی۔ سید وحید الدین سلیم، اے ڈی مظہر اور وزیر آغا نے اکادمی کے قیام میں مولانا کی معاونت کی۔اکادمی کے مالی وسائل اگرچہ محدود تھے لیکن اس نے نہ صرف کم قیمت پر اعلیٰ معیار کے کلاسیکی ادب کی متعدد کتابیں شائع کیں بلکہ ادبی دنیا کو بھی دنیا کا ارزاں اور درخشاں ترین رسالہ بنا دیا۔اکادمی نے ادبی دنیا کے دورِ پنجم میں تین صد سے زائد صفحات کا رسالہ عام قارئین کو صرف ایک روپے میں فراہم کیا اور یوں قومی زبان سے رغبت و محبت کے رشتوں کو ادب کے وسیلے سے استوار کرنے کی کوشش کی۔

مولانا صلاح الدین احمد فطری طور پر رجائیت پسند تھے اور وہ مایوسی کی دبیز تاریکی سے بھی اُمید کی کرن تلاش کر لیتے تھے۔لیکن جب اُردو کے قومی مقاصد کو پس پشت ڈالا جانے لگا تو ان کے ہاں زہر خند کا روّیہ پیدا ہوا۔اس کی ایک صورت اُس وقت سامنے آئی جب انھوں نے انجمن آزاد خیال مصنفین کے پہلے سالانہ جلسے میں خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے اُن خواص کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا جو اپنی زبان اُردو کی بجائے انگریزی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔مولانا کا یہ خطبہ دسمبر ۱۹۵۶ء کے ادبی دنیا میں ان الفاظ کے ساتھ شائع ہوا:

> ''حضرات! یہ ایک لمحہ فکریہ ہے عہد حاضر کے اُن خواص کے لیے جو آج اپنی زبان کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتے اور اپنے گزشتہ فرنگی حاکموں کی زبان کو اپنے سینے سے لگائے اور اپنی زبانوں پر چڑھائے ہوئے ہیں اور اگرچہ ان میں کوئی خسرو، کوئی فیض، کوئی بیدل اور کوئی گرامی نہیں ہے اور اگرچہ یہ امر بے حد مشکل ہے اور قریب قریب محال ہے کہ انگریزی میں صاحبِ تصنیف ہو سکیں یا کم از کم اہلِ زبان کی سی زبان بول یا لکھ سکیں تاہم وہ اپنے اور اپنے بچوں کی بہترین توجہ انگریزی کے حصول پر صرف کرتے یا کرواتے اور اسی نسبت سے خود اپنی زبان کی طرف سے تغافل و تساہل میں ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔''(۳۹)

۱۹۶۳ء میں مولانا صلاح الدین احمد نے شام ہمدرد میں یہ عبرت ناک واقعہ بیان کیا کہ جب اہل مغرب سنتے ہیں کہ ہماری قومی زبان بولنے والوں کی تعداد دنیا بھر میں تیسرے نمبر پر ہے اور اپنی آسانی کے لحاظ سے یہ زبان مشرق میں پہلا درجہ رکھتی ہے تو وہ اسے سیکھنے کے لیے خوشی خوشی ہمارے ملک میں آتے ہیں لیکن چند روز بعد وہ پریشان ہو کر یہ کہتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں کہ ''یہاں اُردو نہیں بلکہ غلط قسم کی انگریزی بولی جاتی ہے، پھر ہم ان لوگوں کے درمیان رہ کر اپنی انگریزی کیوں بگاڑیں۔''(۴۰)

اسی طرح چینی وزیر اعظم چواین لائی کے دورہ پاکستان کے حوالے سے انھوں نے ادبی دنیا میں جو واقعہ قلم بند کیا وہ ہماری قومی غیرت کو جگانے کے لیے کافی ہے۔ مثلاً جب چین کے وزیر اعظم یہاں آئے تو یار لوگوں نے چاہا کہ وہ ان سے انگریزی بلوائیں۔ لیکن انھوں نے یہ کہہ کر ہماری قومی غیرت کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا کہ ''چین گونگا نہیں ہے''۔ مولانا اس واقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''بلاشبہ چین گونگا نہیں مگر ہم گونگے ضرور ہیں اور اندھے بھی، کیوں کہ ہم انگریزی کے دھندلکے ہی میں ٹکریں مارتے پھر رہے ہیں اور زندگی کے آفتاب کی کوئی کرن ہماری بے بصر آنکھوں تک نہیں پہنچتی۔''(۴۱)

ادبی دنیا نے گونگے ہونٹوں کو زبان اور بے بصر آنکھوں کو بینائی عطا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اُردو زبان کے اس نازک ترین لمحہ پر مولانا صلاح الدین احمد نے اُردو یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی اور یہ وہ خواہش تھی جس کے لیے بابائے اُردو زندگی کے آخری ایام میں بے تاب و سراپا اضطراب تھے۔ مولانا نے صدر مملکت سے گزارش کی کہ وہ اُردو یونی ورسٹی کے قیام کے لیے ایک فنڈ کا اجرا فرما کر اسے اپنے نام کا وقار اور تحفظ عطا فرمائیں لیکن مولانا صلاح الدین کی یہ آواز بھی صدا بہ صحرا ثابت ہوئی جس پر انھوں نے ادبی دنیا میں درد بھرے انداز میں لکھا کہ ''اگر ایک کمشنر صرف اپنی ڈویژن سے امرا کے بچوں کے ایک مغربی طرز کے سکول کے لیے اُنتالیس لاکھ روپے جمع کر سکتا ہے تو ہماری مملکت کا صدر اپنی ذرا سی توجہ سے پچاس لاکھ روپے کی وہ ضروری رقم کیوں نہیں فراہم کر سکتا جو ملک بھر میں ایک اُردو یونی ورسٹی کے قیام کے لیے درکار ہے اور ظاہر ہے کہ عوام کے لیے اپنی قومی زبان کی ایک یونی ورسٹی امرا کے لیے انگلستانی زبان کے ایک نقلی سکول سے ہزار ہا درجہ بہتر اور مفید ہے۔''(۴۲) لیکن مولانا کا اُردو یونی ورسٹی کا خواب اُن کی حیات میں شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

الغرض ماہ نامہ ادبی دنیا کا شمار اُردو کے اُن چند اہم رسائل میں ہوتا ہے جن کی اشاعت کا اوّلین مقصد اُردو زبان و ادب کی بقا، تحفظ اور فروغ تھا۔ آزمائش کی اس گھڑی میں مخالفت کے طوفانوں میں ڈولتی ناؤ کا پتوار ادبی دنیا نے اس مضبوطی سے تھاما کہ علاقائی تعصب اور تنگ نظری کے طوفانی دھاروں کا رُخ موڑ دیا۔ اس کی اُردو بولو تحریک دنیا کی سب سے بڑی امن پسند تحریک تھی۔ اس کی اپیل ملک گیر اور اثرات لامحدود

تھے۔اس جریدے نے اُردو کو ثروت مند بنانے کے لیے ادیبوں کا ایک بڑا طبقہ پیدا کیا اور عوام کی اُردو دوستی کو مستحکم کرنے کے لیے آخری دم تک جدوجہد کی۔عوامی سطح پر اسے نمایاں کامیابی ہوئی لیکن سرکاری سطح پر اس کو خاطر خواہ پذیرائی حاصل نہ ہوسکی۔چناں چہ قومی زبان کا مسئلہ ایسا الجھا کہ آج تک بدستور قائم ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) ڈاکٹر انور سدید،مولانا صلاح الدین احمد ایک مطالعہ،اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان،اشاعت اوّل،مئی ۱۹۹۱ء،ص ۷۰

(۲) میاں بشیر احمد،بحوالہ،ہندی اردو تنازع،ڈاکٹر فرمان فتح پوری،طبع اول،کراچی،۱۹۷۷ء،ص ۲۹۵

(۳) ڈاکٹر انور سدید،مولانا صلاح الدین احمد ایک مطالعہ،ص ۷۳

(۴) مولانا صلاح الدین احمد،"بزم ادب"(اداریہ)،ماہنامہ ادبی دنیا،لاہور،جولائی ۱۹۴۳ء،ص ۷

(۵) مولانا صلاح الدین احمد،ماہنامہ ادبی دنیا،شمارہ:۳،جلد:۲۴،لاہور،مارچ ۱۹۴۶ء،ص ۳

(۶) ایضاً،ص:۹

(۷) ایضاً،اپریل ۱۹۴۶ء،ص ۳

(۸) ایضاً،،مئی ۱۹۴۶ء،ص ۳

(۹) ایضاً،جون ۱۹۴۶ء،ص ۳

(۱۰) ایضاً،،اگست ۱۹۴۶ء،ص ۱

(۱۱) ایضاً،،ستمبر ۱۹۴۶ء،ص ۱

(۱۲) ایضاً،،اکتوبر ۱۹۴۶ء،ص ۱

(۱۳) ایضاً،نومبر ۱۹۴۶ء،ص ۱

(۱۴) ایضاً،فروری ۱۹۴۷ء،ص ۱

(۱۵) ایضاً،ص ۳۶

(۱۶) ایضاً،ص ۲۸

(۱۷) ایضاً،اپریل ۱۹۴۶ء،ص ۹

(۱۸) مولانا صلاح الدین احمد،"اردو بولو" تحریک کا صفحہ،ماہنامہ ادبی دنیا،شمارہ:۱۳،جلد:۲۴،لاہور،جنوری ۱۹۴۶ء،ص ۲

(۱۹) مولانا صلاح الدین احمد،"بزمِ ادب"(اداریہ)ماہنامہ ادبی دنیا،لاہور،جولائی ۱۹۴۵ء،ص ۹

(۲۰) مولانا صلاح الدین احمد،"بزمِ ادب"(اداریہ)،ماہنامہ ادبی دنیا،لاہور،اپریل ۱۹۴۶ء،ص ۹

(۲۱) مولانا صلاح الدین احمد،" کہنے کی باتیں"(ذیلی عنوان)ماہنامہ ادبی دنیا،،لاہور،جنوری ۱۹۴۷ء،ص ۳۲

(۲۲) مولانا صلاح الدین احمد،ماہنامہ ادبی دنیا،،لاہور،جنوری ۱۹۴۷ء،ص ۲۶

(۲۳)مولانا صلاح الدین احمد، "اردو بولو" تحریک کا صفحہ، ماہنامہ ادبی دنیا، لاہور، مئی ۱۹۴۶ء، ص ۴

(۲۴) مولانا صلاح الدین احمد، ماہنامہ ادبی دنیا،، لاہور، نومبر (۲) ۱۹۴۶ء، ص ۱۴

(۲۵) ایضاً ص ۱۵

(۲۶) مولانا صلاح الدین احمد، ماہنامہ ادبی دنیا، لاہور، دسمبر ۱۹۴۸ء، ص ۲۳

(۲۷) ایضاً ص ۲۵

(۲۸) مولانا صلاح الدین احمد، "ہماری قومی زبان کا مستقبل"، ماہنامہ ادبی دنیا، لاہور، دسمبر ۱۹۴۹ء، ص ۱۹

(۲۹) مولانا صلاح الدین احمد، "اردو کی ترویج و ترقی کے ذرائع"، ماہنامہ ادبی دنیا، لاہور، جولائی ۱۹۴۹ء، ص ۱۳۵

(۳۰) مولانا صلاح الدین احمد، ماہنامہ ادبی دنیا، شمارہ خاص، لاہور، ۱۹۵۱ء

(۳۱) مولانا صلاح الدین احمد، ماہنامہ ادبی دنیا، دسمبر ۱۹۴۹ء، ص ۲۴

(۳۲) مولانا صلاح الدین احمد، "ہماری قومی زبان کا مستقبل"، ماہنامہ ادبی دنیا، لاہور، دسمبر ۱۹۴۹ء، ص ۲۶، ۲۷

(۳۳) مولانا صلاح الدین احمد، "اردو بولو" تحریک کا صفحہ، ماہنامہ ادبی دنیا، لاہور، اکتوبر ۱۹۴۹ء، ص ۲

(۳۴) مولانا صلاح الدین احمد، "بزم ادب" (اداریہ)، ماہنامہ ادبی دنیا، لاہور، مئی ۱۹۵۴ء، ص ۷

(۳۵) مولانا صلاح الدین احمد، "بزم ادب" (اداریہ)، ماہنامہ ادبی دنیا، لاہور، اگست ۱۹۵۳ء، ص ۴

(۳۶) مولانا صلاح الدین احمد، "اردو بولو" تحریک کا صفحہ، ماہنامہ ادبی دنیا، شمارہ: ۴، جلد: ۲۴، لاہور، اپریل ۱۹۴۶ء، ص ۵

(۳۷) مولانا صلاح الدین احمد، "بزم ادب" (اداریہ)، ماہنامہ ادبی دنیا، لاہور، مارچ ۱۹۵۴ء، ص ۶

(۳۸) مولانا صلاح الدین احمد، "بزم ادب" (اداریہ)، ماہنامہ ادبی دنیا لاہور، اکتوبر ۱۹۵۴ء، ص ۱۱

(۳۹) مولانا صلاح الدین احمد، خطبہ صدارت (انجمن آزاد خیال مصنفین)، ماہنامہ ادبی دنیا، لاہور، اپریل ۱۹۵۶ء، ص ۴

(۴۰) مولانا صلاح الدین احمد، اردو کے چند مسائل (مقالہ)، ماہنامہ ادبی دنیا، لاہور، جولائی ۱۹۶۳ء، ص ۲۸

(۴۱) ایضاً

(۴۲) مولانا صلاح الدین احمد، ماہنامہ ادبی دنیا، شمارہ پنجم، دور پنجم، لاہور، ص ۵